ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

دیوند راسر کے افسانوی مجموعے ''پرندے اب کیوں نہیں اڑتے'' کا سماجی تجزیہ

A SOCIAL ANALYSIS OF DEVENDRASAR'S STORIES COLLECTION "PARINDAY AB KEUN NHE URRTAY"

Kamran Joyia,
MPhil (Urdu) Lahore Leads University Lahore abnerjoyia1@gmail.com
Dr. Muhammad Rahman,
Assistant Professor Department of Urdu Hazara University Mansehra
Azwar Abbas,
Lecturer Department of Urdu Hazara University Mansehra

Abstract

The famous fiction writer, critic and intellectual Devand Rasar was born in 1928 and died in 2012 at Delhi. He is known for his thought-provoking writings on the problems, possibilities and implications of literature in the modern era. His fiction includes "Murda Ghr", "Rait aor samader", "Teen khamosh chezain aor aik zard phool", "Purani Tasweer nay rang", "Rooh ka aik lmha aor soli per panch bars", "Bajli Ka khamba", "Kalay gulab ki saleeb", "Siyah thill", "Ham shehr badal gay". His collection "Parinday ab keun nhe urrtay" is presented in this article.

Most of the Stories of "birds don't fly anymore" reveal the bitter truths in life. Apart from exploring the causes of human helplessness and helplessness in the era of materialism and humiliation of humanity in the collection of fictions, this important question has also been raised as to why man has become so weak. That now he wants to live as a pine tree. The pine tree is a metaphor for human bitter life also because when this tree is wounded by its own thorns, the emanation from its body starts reaching its roots. Man is also walking with the burden of his sorrows on his head and the chest of his body also reaches his heels. But just as a pine tree never bows its head down, so a human being never succumbs to sorrows and sufferings till the end. Fiction writers often expose the poisonous facts of life's bitterness in their stories and provoke the reader to think about the humiliation of humanity through their themes.

Key Words:

Devand Rasar, born in 1928, died in 2012, Delhi "Murda Ghr", "Rait aor samader", "Teen khamosh chezain aor aik zard phool", "Purani Tasweer nay rang", "Rooh ka aik lmha aor soli per panch bars", "Bajli Ka khamba", "Kalay gulab ki saleeb", "Siyah thill", "Ham shehr badal gay", "Parinday ab keun nhe urrtay".

دیوندر اسر افسانوی نثر کے معروف لکھاری ہیں۔انہوں نے اردو کو معروف افسانوں سے ثروت مند بنایا۔ان کے اس مجموعے کے پہلے افسانے"وے سائڈ ریلوے اسٹیشن" میں جدید معاشرے کے تضادات کھل کر بیان ہوئے ہیں۔ جن کا خلاصہ ذیل کے تین مختلف بیانات سے واضح ہو جاتا ہے۔افسانے کے کردار نمبر مرچٹلا کا بیٹا"پرش" شہر بسانے کے لیے درخت کاٹنے کے حق میں دلیل پیش کرتا ہے اور کہتا ہے:

> ''لیکن جب جنگل نہیں کٹیں گے تو شہر کہاں بسیں گے۔کھیتی باڑی کے لیے بھی تو جنگل کٹتے ہی ہیں ناں۔جہاں جنگل کٹتے ہیں وہاں گاؤں بستے ہیں۔پھر شہر بنتے ہیں، کارخانے لگتے ہیں۔ڈیم بنتے ہیں لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔خوشحالی بڑھتی ہے، لوگ ترقی کرتے ہیں۔ تہذیب پھلتی پھولتی ہے۔اسی میں انسانی بقاء وارتقا کا راستہ ہے۔''(۱)

یوں محفل میں موجود نوجوان، پرش کی اس دلیل کے خلاف نہایت جذباتی انداز میں اپنا سخت رد عمل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> ''ادھر جہاں پہاڑوں،پربتوں پر دور دور تک ہریالی دکھائی دیتی تھی۔ اب وہاں ننگی چٹانیں دکھائی دیتی ہیں اور برسات کا پانی کھیتی باڑی گھر بار، مال مویشی سب کچھ بہالے جاتا ہے اور پھر سکھڑا پڑتا ہے۔تالاب کنویں، پوکھ سوکھ جاتے ہیں۔دھرتی باسی بھوکے، ننگے، پیاسے آسمان پر نظریں گاڑے پانی کی ایک ایک بوند کے لیے دعا مانگتے ہیں۔''(۲)

اس فرش پر بیٹھی عورت دونوں کی بحث سمیٹنے کے لیے ایک ستر سالہ بڑھیا کا دلچسپ قصہ بیان کرتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

"جہاں وہ پیدا ہوئی تھی وہاں جنگل ہی جنگل تھا۔جب جنگل کٹنے شروع ہوئے تو وہ وہاں سے چلی گئی۔پیڑ کٹ رہے تھے اور شہر بنناشروع ہو گیا تھا۔پینسٹھ برس بعد جب وہ واپس لوٹی۔اس شہر میں جو پہلے کبھی جنگل تھا، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی اس جگہ اب بڑی بڑی فلک بوس عمارتیں اسکائی اسکریپر، فلائی اوور تھے۔اس نے دیکھا اسکولی بچے جگہ جگہ پودے لگا رہے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں پلے کارڈ تھے۔پیڑ لگاؤ شہر بچاؤ، وہ عورت بولی ستر برس پہلے جب میرا جنم ہوا تو یہاں جنگل تھے۔پیڑ کاٹ کاٹ کر یہ شہر بسایا گیا۔ اور پیڑ کٹتے گئے اور لوگ اس شہر کو کنکریٹ کا جنگل کہنے لگے۔اور آج پھر وہ اس نئے جنگل سے بچنے کے لیے پیڑ لگا رہے ہیں۔"(۳)

یعنی جدید معاشرے کے دوغلے پن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے تو معاشرے کے باسی ترقی کے نام پر قدرتی حسن اور فطرتی خزانے جنگل جیسی نعمت کی تباہی میں جتے ہوتے ہیں اور پھر احساسِ زیاں ہونے پراس نقصان کے ازالے کے لیے کوششوں کا آغاز کرتے ہیں مگراس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر جاتا ہے۔افسانہ نگار کی بظاہراس سادہ کہانی میں معاشرے کا دوغلا پن ایک مخصوص رمزیت میں آشکارہوا ہے۔اس مجموعے کا دوسرا افسانہ "آرکی ٹیکٹ" علامتی تیکنیک، غیر مرئی کرداروں کے تناظر میں مرتب ہوا ہے جس میں بریف کیس اوراس کے مالک کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔کہانی کا "راوی" جب آر کی ٹیکٹ کے ہاں اپنے گھر کا ڈیزائن بنوانے جاتا ہے تو دوران گفتگو آرکی ٹیکٹ اسے اپنا بریف کیس سامنے سے ہٹانے کا کہتے ہوئے زندگی کے اہم واقعے کی تفصیل بیان کرتا ہے، کہ کمرشل پلازا کی بلڈنگ میں دوران رہائش اس کا ادھیڑ عمر پڑ وی بلند عمارت سے گر کر مر گیا تھا۔مرحوم پڑوی عمومی موت کے بعد اس کی لاش کے پاس ہی وہی بریف کیس پڑا ہوا تھا مگر خالی تھا۔یہ تلخ اور اندوہناک سانحہ بھلانے کے لیے وہ کچھ عرصہ گاؤں بھی گزارآیا مگر واپس لوٹتے ہی اسے وہ مرحوم ہمسایہ بریف کیس تھامے ہر جگہ اپنے آگے چلتا نظر آتا، جو چھوتے ہی غائب بھی ہو جاتا۔ایک دن خواب میں اسے سمندر کنارے وہی مرحوم ہمسایہ اپنے آگے آگے چلتا نظر آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھنے پر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے مسکرا کر وہی بریف کیس سمندر کنارے چھوڑ کر سمندر میں کود پڑا۔بریف کیس کھولنے پر اب کی بار وہ خالی ہی تھا۔اگلے ہی لمحے آنکھ کھلنے پر نہ تو وہاں ریت تھی اور نہ ہی کوئی سمندر۔سارا منظر ہی سرے سے غائب ہو گیا تھا۔اس کے بعد "آرکیٹیکٹ" نے فلیٹ پر جانا تو ترک کر دیا مگر پھر بھی اسے امید ہے کہ اس کا مرحوم ہمسایہ ایک نہ ایک یہ درد ناک کہانی سننے کے بعد غائب ہو جائے گا۔راوی بو جھل قدموں سے اسی بریف کیس کے بارے میں سوچتے ہوئے واپسی کی سیڑھیاں دن واپس ضرور لوٹے گا اور اھی ملاقات پر وہ اس سے اس کی موت کا سبب جانے کی کوشش ضرور کرے گا ؟' آر کی ٹیکٹ اترنے لگتا ہے۔

اس طرح "جنگل" افسانے کا پس منظر بھی دیوندراسر کے متعدد ما بعد الطبیعیاتی کرداروں پر مرتب افسانوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ "جنگل" کے عنوان سے افسانے پر ماورائیت کا رنگ چڑھا ہوا ہے جس کی تہہ دار کہانی میں انسانی روپ میں مافوق الفطرت ارواح آبادی کے آخری سرے پر گھنے جنگل کی حدود سے ذرا پہلے سرائے میں رات بسر کرنے والے انسانوں سے مصروف گفتگو دکھائی دیتی ہیں۔انسانوں اورارواح کے مابین سردرات میں آگ کے روشن الاؤ کے گرد سجی محفل میں فقیر علی مانی میں اس سے بھی زیادہ بھیا نک جنگل میں سے گزرنے کی داستان سناتا ہے:

"لیکن میں کب سے سفر میں ہوں۔کئی صدیوں کا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔میں جنگل میں پیدا ہوا تھا۔وہیں بڑا ہوا، جوان ، خوبرو حساس، وہیں میری موت ہوئی اور جب میں نے دوبارہ جنم لیا، بالغ ہوا تو میں نے خود ایک جنگل بنایا۔لیکن سیدھا جنگل نہیں تھا جس میں، میں جوان ، خوبرو حساس ہوا تھا۔وہ جنگل تھا جس میں ، میں روسیاہ اور بے حس ہو گیا تھا۔اور پھر میں نے اور پھر تم نے اس آدمی کی ہتیا کردی؟ ہم سب نے کہاتھا۔"(۴)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اس طرح فقیر علی اپنے ہاتھوں قتل کے واقعے کی تفصیلات بیان کرتا ہے کہ کس طرح اس نے اس آدمی کی نائی کی گرہ پخت کرتے ہوئے اسے قتل کردیا تھا۔مادام مردول کی مذکورہ واقعے کی تفصیلات کی تائید اورساتھ ہی فقیر علی کے اچانک غائب ہو جانے پر قاری کو بھی مادام مردول اورفقیر علی دونوں کے انسانی روپ میں لاکھوں سال قبل کی دنیا میں گھومنے پھرنے والی غیر مرئی اورمافوق الفطرت حیثیت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

اس مجموعے کے چوتھے افسانے" پرچھائیوں کا تعاقب" کی کہانی کا پس منظر بھی یکساں ہی ہے۔افسانے کی تہہ درتہہ اورہم انداز تحریرمیں اس کہانی میں بھی گزشتہ افسانے "جنگل"کی طرح ماورائے حقیقت اورتجریدیت پر مبنی اسلوب کی سیڑھی استعمال ہوئی ہے۔ افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ دورانِ سفرایک مصورراوی کو اس کی تصویر بنا کر دکھاتے ہوئے ضد کرتا ہے کہ یہ راوی کی ہی تصویر ہے جسے راوی اپنے چہرے پرتل کی عدم موجودگی کی بنا پردرست تسلیم نہیں کرتا۔مصوردلائل پیش کرتا ہے کہ مشہور فلم پروڈیوسر موہن ڈیسائی اورراوی دونوں کے چہرے کی آپس میں مشابہت ثابت کرتی ہے کہ موہن ڈیسائی اپنے دوستوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے لیکن یہ تلاش دوستوں کی نہیں بلکہ اس تلاش کے پس پردہ اپنی ہی ذات کی تلاش میں گم رہتا ہے۔جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بچپن کے بعد انسان اپنے آپ میں وقوع پذیر تبدیلیوں کے سبب خود کو تلاش ہی نہیں کر پاتا۔راوی کو پریشان دیکھ کر مصور انکشاف کرتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی تصویردراصل اس شخص کی تصویر ہے جس کا وہ ایک عرصے سے متلاشی تھا۔مصور کی مزید گفتگو سے افسانے میں ابہام کا عنصر دو چند ہو جاتا ہے۔اس طرح مصور کے مطابق وہ اپنے بچپن کے دوست کے ہمراہ تقسیم کے بعد کام کی تلاش میں دلی آیا تھا۔مگر ذاتی مصروفیت آڑے آنے سے دونوں کا آپس میں میل جول کم ہوتے ہوتے بالآ خر ختم ہو کررہ گیا۔اب وہ برسوں سے اپنے دوست کا متلاشی ہے اور اسی کی تلاش میں اب وہ دلی جا رہا ہے۔تلاش کے اس سفر میں اس کے ایک جاننے والے نے اس (مصور) کی بظا ہر کسی خانقاہ کا فقیر نظر آنے والے شخص سے ملاقات کروادی جو درحقیقت گمشدہ لوگوں کی تصاویر بنا کر انھیں ڈھونڈھ کرلاتا تھا۔اپنے گھر کے تہہ خانے میں تصاویر بنانے میں مگن فقیر نما شخص نے (مصور کے) اس گمشدہ دوست کی عادات واطوار کے بارے میں سوالات کے بعد اپنے پاس موجود تصاویر میں سے ایک تصویر پہچاننے کے لیے پیش کی۔افسانے کی تہہ داری اس وقت مزید پیچیدہ پیدا ہو جاتی ہے جب وہ فقیر نما شخص راوی کو اپنے بارے میں آگاہ کرتا ہے کہ وہ خود توریسرچ کا آدمی تھامگر ایک دن وہ دور کسی ایسی آبادی میں جانکلا تھا جہاں ایک عورت اپنا شہر چھوڑ کر غیرآباد علاقے میں آکر فلاح و بہبودی کے کاموں میں مگن رہتی تھی۔اس عورت سے ملتے ہی فقیر نما شخص کو شک گزرا کہ اس سے قبل بھی دونوں کی آپس میں ملاقات ہو چکی ہے۔مگر اس عورت نے یکسر انکار کرتے ہوئے جواب دیا کہ ہرآدمی کا کوئی نہ کوئی ہم شکل ضرور ہوتا ہے۔اس عورت سے دوبارہ ملنے کے وعدے پر واپس آکر جب وہ فقیر نما شخص دوسرے دن اس عورت سے ملنے گیا تو وہ کہیں اور جا چکی تھی۔اس کے بعد اس فقیر نما شخص نے تصاویر بنا کر گمشدہ لوگوں کی تلاش کا عمل شروع کر دیا۔

اب یہاں سے کہانی کا رخ پھر سے راوی اور اس کے ہم سفر مصور کی جانب واپس پلٹ جاتا ہے۔ مصور کے بقول اس کی فقیر نما شخص سے ملاقات بھی اپنے گمشدہ دوست کی تلاش میں مدد کے سلسلے میں ہوئی تھی۔راوی ہم سفر مصورسے سوال کرتا ہے کہ فقیر نما شخص نے پھر اسے گمشدہ دوست سے ملوایا بھی تھا یا نہیں؟ جواب میں مصور بتاتا ہے کہ وہ کچھ دنوں بعد اس فقیرنما شخص کے تہہ خانے میں اس سے دوبارہ ملنے گیا تو وہ ایک موٹی سی فائل سے اسکیچ نکال لایا، تو مجھے حیرانگی اس بات پر ہوئی کہ وہ کسی اور کا نہیں بلکہ میرا اپنا اسکیچ تھا۔مصور کو مزید حیرت کا اس وقت سامنا ہواجب اسکیچ پر سے نگاہ بناتے ہی دو فقیرنما شخص اپنی کرسی سے غائب تھا تاہم ہر طرف بکھری تصاویر میں سے ایک تصویر پر اس کی عینک رکھی ہوئی تھی۔غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تصویر غائب ہونے والے شخص کے بچپن کی تصویر تھی۔اس کے بعد مصور غائب ہو جانے والے شخص کا پائپ اوراس کی تصویر اٹھائے باہر نکل آیا۔مصور کے بقول اسے تنہائی میں وہی چہرہ یا درہتا ہے اور اسی کی تلاش میں اب بھی وہ مارا مارا پھر رہا ہے مگر آج تک نہ تو اسے وہ غائب ہونے والا شخص کہیں مل پایا اور نہ ہی اس نے تلاش کا سلسلہ ختم کیا اور بڑھاپا چھا جانے کے باوجود بھی اس کی تلاش کا عمل جاری ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اک عرصہ بیت جانے کے بعد مصور کو اب یہ سمجھ نہیں آرہا کہ وہ اپنے دوست کی تلاش میں سرگرداں ہے یا پھر اس اچانک غائب ہونے والے شخص کی تلاش میں مصروف عمل ہے۔افسانے کا اختتام بھی تلاش کے عمل کی گھمبیر تا پر ہی ہوتا ہے۔

اس طرح"میرا نام شنکر ہے"نامی افسانے میں نمبروں سے پہچان اور شناخت کا ایک اہم سماجی عمل زیر بحث لایا گیا ہے۔افسانے کے راوی کو انسانوں کے جاندار ہونے کے ناطے ہندسوں سے ان کی پہچان کرنا سخت ناگوار گزرتا ہے۔راوی کے بقول مکان کے رہائشی ہونے کی صورت میں بارہ نمبر کے بے جان ہندسوں سے شناخت بن جانے پر ہر کوئی پوچھتا پھرتا ہے کہ کیا وہ بارہ نمبر مکان میں رہتا ہے؟ سکول میں بھی نام کی بجائے یہی بے جان ہندسہ رول نمبر کی صورت شخصیت کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔بیمار ہونے پر یہی سلسلہ وارڈ نمبر، کمرہ نمبراوربیڈ نمبر کی شکل میں انسان کی پہچان بنتا ہے۔اگر بد قسمتی سے انسان قید ہو جائے تو جیل میں بھی یہ ہندسہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہاں بھی بیرک اور قیدی نمبر کا لباس اس کی پہچان بن جاتا ہے۔افسانہ نگار نے یہاں ہندو مذ ہب کا پیروکار ہونے کے ناطے مسلمانوں کے مرنے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد جدید شہروں میں ان کی قبر کے نمبروں کی الاٹمنٹ سے متعلق اہم نکتہ اس لیے زیر بحث نہیں لایا کہ ہندوانہ مذہب میں مردے کو دفنانے کی بجائے جلا کران کی راکھ بھی دریا برد کردی جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے اچھے بلے جاندار انسان کے عمر بھر بے جان ہندسوں کے گورکھ دھندوں کے گھن چکر میں پسنے کی عبرت انگیز کہانی بیان کی ہے۔

افسانہ"جیسلمیر": ماورائے حقیقت ، تجریدیت ، رمزیت اور مبہم انداز تحریر کی بنیادوں پر استوار دیو بند راشٹر کا یہ افسانہ راوی اور ایک لڑکی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر رواں تبصرہ ہے، جس کے آخر میں قاری، دونوں کرداروں کو در پیش واقعات کے بظاہر مختلف منظر نامے مگر ان کے یکساں انجام سے آگاہ ہوتا ہے۔افسانے کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ:

> " مجھے محسوس ہوا کہ میں ریت کے بستر پر پڑا ہوں۔ میں نے پیٹھ کے نیچے ہاتھ پھیرا۔ ریت کے ذرے، میری مٹھی ریت سے بھر گئی.. یا خدا ! میں کہاں آ گیا ہوں؟ میرے سامنے دور دور تک ریت پھیلی ہوئی تھی۔دائیں بائیں آگے پیچھے ہر جانب ریت ہی ریت تھی۔یہاں کوئی راستہ نہیں کوئی منزل نہیں۔بس ریت ہی ریت لال ریت، بھوری ریت، گرم ریت، چھتی ریت جھلتی ریت، ریت کے ٹیلے ، ریت ہی دھوپ تھی ریت ہی سائی تھی۔نہ آغاز نہ انجام۔بس ایک بیکراں ریگستان۔جس طرف نگاہ جاتی تھی ریت ، حد نظر تک ریت۔نہ پانی نہ ہریالی۔بس ریت تھی خالی۔ریت ہی افق تھی ریت ہی شفق..میں کیسے یہاں پہنچ گیا میرا سامان؟اور میرے کپڑے؟ ہلکی ہلکی ہوا سے ریت اڑنے لگی۔ میرے کپڑے اڑ رہے تھے ۔"(۵)

اس طرح راوی کو درپیش واقعات کے برعکس ایک لڑکی بھی بیڈ پر لیٹے خود کو ریت کے صحرا میں محسوس کرتی ہے اور پیٹھ پر ہاتھ پھیر نے پر اس کی مٹھیوں میں بھی ریت بھر جاتی ہے۔پریشان ہو کر اٹھ بیٹھنے پر کمرے میں بجلی کی روشنی اور ہوا میں خوشبو پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔چاروں طرف ریت ہی ریت دیکھ کر وہ حیران ہو جاتی ہے کہ اسے اس ریت میں کون پھینک گیا ہے؟ تری محسوس ہونے پر پہلے تو وہ کپڑے اتار دیتی ہے مگر ساتھ ہی سرد ہوا کے چلتے ہی کپڑے پہنے کے لیے ہاتھ بڑھانے پر اس کے کپڑے ہوا میں اڑ جاتے ہیں اور پکڑنے کے لیے وہ اپنے کپڑوں کے پیچھے بھاگنے لگتی ہے۔راوی بھی تپتے صحرا میں کپڑوں کے پیچھے ہی بھاگ رہا ہوتا ہے جس کے پیچھے ریتلے رنگ کا سانپ بھی بھاگ رہا ہوتا ہے۔ریت کے ذرات ہوا سے اڑا اڑ کر اس کی آنکھوں میں اٹکتے جاتے ہیں۔آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر اسے اپنے کپڑے سرکنڈوں میں اٹکے دکھائی دیتے ہیں جنھیں پکڑتے وقت اس کی انگلیاں شدید زخمی ہو جاتی ہیں۔ دوسری جانب وہ لڑکی بھی اپنے بیڈ روم میں کانٹوں بھرا جسم لیے کھڑی ہوتی ہے۔لائٹ آن کرنے پر اپنا آپ بغور دیکھنے پر اسے جسم پر ریت کے رنگ کا سانپ دکھائی دیتا ہے جو جسم کے ایک سوراخ سے داخل ہو کر دوسری جانب سے باہر نکل آتا ہے۔وہ سانپ اتنی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

بار جسم میں داخل ہو کر باہر نکلتا ہے کہ اسے سانپ اور اپنا جسم ایک ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔حدت میں شدت آنے کے سبب اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوتی ہیں اور وہ بے حس ہوکر اپنے بیڈ پر گر جاتی ہے۔

ادھرراوی بھی گرم ریت پر گرتے ہی اپنے زخمی ہاتھوں سے کیکٹس پر ان کے کپڑے اتار کر پہن لیتا ہے مگر اس کی رگوں سے رستا ہوا خون ریت پر گرنے لگتا ہے۔دوسری جانب لڑ کی بھی کپڑے تو پہن لیتی ہے مگر پیاس سے حلق میں ریت سی لگتی محسوس ہوتی ہے ۔ادھر راوی کا بھی پیاس سے براحال ہوتا ہے۔ البتہ دور کہیں سبزہ نظر آتے ہی وہ سبزے کی جانب دوڑ لگاتا ہے تو اس کے ہمراہ ایک ہرن بھی بھاگنے لگتی ہے۔پانی کی تلاش میں بھاگتے دوڑ تے اچا نک آندھی اسے اپنی لپیٹ میں لے کر ہرن سمیت ریت کے ٹیلے پر پھینک دیتی ہے۔دوسری طرف وہ لڑکی اپنے کمرے سے نکل کرگلی میں بھاگتی ہے، اورپھر گلی سے محلے، محلے سے گاؤں اور گاؤں سے شہر کی سڑکوں شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اسے چہارسو پھیلے سبز باغات دکھائی دیتے ہیں۔پہلے سیلز گرل ، پھر ماڈل گرل اور پھر فلمسٹار اور وہ اوپر ہی اوپر اڑتی جاتی ہے۔آکاش میں ایک جہاز سے دوسرے جہاز میں ایک ملک سے دوسرے ملک کبھی ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل جا جا کر جب وہ تھک ہار کر ہانپنے لگتی ہے تو آندھی اسے بھی بیچ کر حمل کے بستر پر پھینک دیتی ہے۔ادھر راوی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہورہی ہے۔ کبھی فوجی گولیاں چلا رہے ہیں تو کبھی وہ بلوائیوں کے نعروں اور جلاؤ گھیراؤ میں پھنس کر رہ گیا ہے۔راوی اپنے بارے میں سوچنے لگتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے؟ اس کے ساتھ بھاگنے والی ہرنی بھی زخمی حالت میں پڑی ہوتی ہے۔افسانے کا اختتام دونوں کے یکساں انجام پر ہوتا ہے۔صبح گزرنے والے قافلے کو ایک لاش ملتی ہے جس کی تلاشی لینے پر جیب سے وقی سے اودے پور جانے کا ریل گاڑی کا ٹکٹ اور کراؤن ہوٹل کی تیسری منزل کے کمرے سے ملنے والی عورت کی لاش کے پرس سے بھی دقی سے اودے پور جانے والی ریل گاڑی کا ہی ٹکٹ نکلتا ہے۔یوں کہانی ختم ہوجاتی ہے۔

اہم افسانہ ”پرندے اب کیوں نہیں اڑتے“ کے عنوان سے غربت افلاس اور بے روزگاری کے پس منظر میں مرتبہ کہانی کا آغاز ماڈل گرل مس سوزی، جینیس میگھ دت اور موہن دا (راوی) کے کی خواہشمند ماڈل گرل سوزی کی رائے میں دیوار کی آنکھیں تو نہیں ہوتیں مگر آج کل کے بعض انسانوں میں آنکھیں جسم اور دل تک بھی نہیں ہوتا۔میگھ دت کے خیال میں جو بندہ حد سے زیادہ بحث کا عادی ہوا سے فلاسفر تو کہتے ہیں حالانکہ دور افتادہ گاؤں کے پاس فلاسفر کا مطلب پائل کے معنی میں لیا کرتے ہیں۔راوی کے دل میں درد محسوس ہونے پر مس سوزی کے بام سے مالش کرنے پر راوی سو جاتا ہے عمر آنکھ ملنے پر اپنے پاس ہی سوئی مس سوزی کے ہاتھ میں بام کی بجائے مرہم دیکھ کر دہ غربت کے باوجود اس کے پر خلوص جذبے کا قائل ہو جاتا ہے۔

وہ راوی یہ تو جانتا ہے کہ اس کی شراب کی پوری بوتل میگو دت ہی پی گیا تھا مگر نشے کی حالت میں اس کی مس سوزی سے ہم بستری سے وہ لاعلم ہوتا ہے۔مس سوزی کو اس کے ہیروئن کے لیے ہونے والے انٹرویو کی تیاری کے لیے اپنی چند کتا ہیں فروخت کرنے لے جاتا ہے تا کہ وہ نئی ساڑھی اور میک اپ کا سامان خرید کر کم از کم بن سنور کر انٹر ویو دینے جائے تا ہم اس کے جانے کے بعد راوی اس بے چاری کے شام کو کام واپس لوٹنے کے لیے پر یقین ہوتا ہے اور بالآ خرشام کو وہ اداس چہرہ لیے نا کام ہی واپس لوٹتی ہے۔اس طرح کچھ دنوں کے بعد شام تک مس سوزی اور میگھ دت (کالی چون) کے گھر سے غائب رہنے اور میگھو دت کے اکیلے واپس آکر اس سوزی کے ہسپتال داخلے کی اطلاع دینے پر وہ ماں سے بطور نشانی ملی ہوئی انگوٹھی بیچنے کے بعد ملنے والی رقم سے دوائیاں اور پھل خرید کر ہسپتال جاکر رس کے سرسوزی کالی چین کا نام پکارنے پر اصل ماجرے کا علم ہوجاتا ہے کہ مس سوزی کے ہسپتال میں داخل ہونے کے پیچھے اصل کہانی کیا تھی؟ مس سوزی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آنے کے بعد موان داسے نگاہیں چرانے لگتی ہے مگر موہن داسے سہارا دے کر بستر پر لٹاتے ہوئے اپنی مزید کچھ کتا ہیں بیچنے اورمس سوزی کے لیے پھل اور دوائیاں خرید نے میگھ دت کو بھیجتا ہے۔وہ خود مس روزی کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے اصل حقائق سے آگاہ کرتا ہے کہ اس کی جان تو بچ گئی ہے ،اور جلد ہی وہ ٹھیک بھی ہو جائے گی مگر اب وہ کبھی ہیروئن یا ماں نہ بن پائے گی۔یہ منحوس خبر سنتے ہی مس سوزی آہستہ سے کمرے میں جا کر خود کشی کر لیتی ہے۔افسانے کے میگودت، اگردیو اورسوزی پر مشتمل تینوں کردارٹوٹے دلوں کے حامل ، نہایت دکھی اور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

محبت کو ترستے ہوئے ہیں جو انسانی نفرتوں کے جال میں جکڑے ہونے کے باوجود امیدوں کے سہارے زندہ ہیں۔یہ لوگ اچھے مستقبل کی امید کی لو لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔"پرندے اب کیوں نہیں اڑتے" کا یہ جملہ بہت متاثر کن ہے اب تو حالت یہ ہوگئی ہے۔

''جو منزل یا تھی اس کے راستے بھول گئے اور جو راستے یاد تھے ان کی کوئی منزل نہیں
۔''(۶)

اس طرح افسانے کا یہ جملہ بھی نہایت معنی خیز ہے۔

''یہ سب لمحے وہ پیراڈائیز میں گزاردے گا جہاں پیالے سالم ہوتے ہیں لیکن ادیب اور
مصو رٹوٹتے ہیں تو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔''(۷)

"روشنی کا سفر"میں افسانہ نگار نے "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" پر استوار کرتے ہوئے سماج کے المناک منفی رویے کی نشاندہی کی ہے۔ کہ معاشرے کے منفی سوچ کے حامل افراد اپنے ارد گرد بسنے والوں سے کسی جان پہچان اور انھیں در پیش مسائل سے آگاہی حاصل کیے بغیر مدد و تعاون کی بجائے اپنی ذہنی سوچ اور ظاہری عوامل کی بنیاد پر ہی لغو و بے سروپا الزامات دھر نے اور چہ میگوئیاں کرنے کا وطیرہ اپنائے رکھتے ہیں۔افسانے کی مرکزی کردار محلے کی نئی پڑوسن کے ساتھ بھی یہی کیا کچھ اس وقت پیش آتا ہے جب وہ شام کے وقت راوی کے قریبی پڑوسی ہونے کے ناطے دروازے پر دستک دیتے ہوئے ماچس ادھار مانگنے اس کے گھر میں داخل ہوتی ہے۔ محلے دار اس عورت کی دیدہ دلیری پر باتوں کا پتنگڑ بنا کر اس کی کردار کشی کرتے ہوئے اس کی گھریلو مصروفیات پر بھی کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ نئی پڑوسن کے گھر کے سامنے رہائش پذیر شخص سے سالہا سال تک بات چیت نہ کرنے والے کے گھر کا محسن بھی جاسوسی کے لیے لوگوں سے اب بھرا رہتا ہے۔ اک روز فوجی وردی میں ملبوس جوان پاکٹ کے اس نئی پڑوسن کے ہاں آکر جنسی خوشی رات بسر کرنے اور پھر صبح واپس جانے پر بھائیوں کو نیا موضوع ہاتھ آجاتا ہے اور وہ سب مل کر اس پائلٹ کو اس عورت کا دیرینہ یار تو کبھی نیا گاہک ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں ۔عورت کے غمزدہ اور خاموشی سے واپس آنے پر ہمسائے اس کی خیریت دریافت کرنے کو مل جاتے ہیں۔پڑوسن کے گھر سے باہر نکلنے پر وہ آوازے کستے ہیں کہ اُس کا یارا سے دغا دے گیا ہے اس لیے اب نئے بجائے اس کی خاموشی کو بھی شک ہی کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔اقتباس دیکھیں۔

''یوں کچھ ہی عرصہ بعد ہی رات کو اس پڑوسن کے خاموشی سے اپنی گاڑی میں باہر روانہ
ہوتے ہی اس کا ہمسائیہ راوی بھی پیچھا کرتے ہوئے دریا کنارے پہنچ جاتا ہے جہاں وہ
پڑوس گاڑی سے چٹائی نکال کر بچھاتے ہوئے پہلے تو اس رکھانے کی دو ہیں اور پیالیاں
سجانے میں مصروف ہوتی ہے اور پھر راوی کویوں لگتا ہےوہ آئینہ نکال کراس میں اپنا
آپ بغورد یکھ رہی ہے لیکن جب وہ مٹی کا دیا روشن کرتے ہوئے اسے پانی کی لہروں میں
بہا کر پکارتی ہے کہ" ڈیر ان بے رحم لہروں میں تم کب تک بھٹکتے رہو گے؟ روشنی بھیج
رہی ہوں واپس چلے آؤ۔"(۸)

اس طرح یہ درد ناک منظر راوی کی برداشت سے اہر ہو جاتا ہے کیونکہ آئینے کی بجائے اسے پڑوسن کے ہاتھ میں اس مرحوم پائلٹ کی تصویر نظر آ جاتی ہے جس کے بعد راویخاموشی سے گھر واپس لوٹ آتا ہے۔سارے پڑوسی حسب عادت اپنی ذہنی پسماندگی کے سبب پڑوسن کے غائب ہونے پر حسب عادت اپنی اس گھٹیا بحث میں مگن رہتے ہیں۔راوی کمرے میں واپس آکر اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر دریا میں تیرتے دیے کی روشنی کا سفر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہی نہیں ہوتا۔

افسانہ''آپریشن ''کی کہانی کا آغاز ہسپتال کے وارڈ کے منظر نامے سے ہوتا ہے جہاں امرا کے خاوند (کے سی) کا آپریشن متوقع ہوتا ہے مگر اس کی بیوفا بیوی امیرا خاوند کی بیماری اوبچوں کی پرورش سے بے پرواہ اپنے محبوب رمیش کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندیوں میں مصروف رہتی ہے۔امیرا کے بتانے پر کہ وہ کیوں کسی کا بھیانک چہرہ دیکھ کر بہت پریشان ہے؟ تو میں اظہر یہ سوال کرتا ہے کہ ویسے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

بھی وہ کون سا خوبصورت تھا، امیرا اپنے خاوند کے منہ پر ہی اسے آگ میں جل جانے اور ٹرک کے نیچے آنے کی بددعائیں دیا کرتی تھی،اور شاید انہی بد دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ اس کا خاوند کارکے نیچے آکر شدید زخمی ہو گیا تھا۔یوں امیرا کو "کے سی" کے ساتھ دس برس مصیبتوں بھری زندگی سے چھٹکارہ پانے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔شام کو ارمیش کے ساتھ واپسی پر میرا اپنے گھر کے سامنے گاڑی سے اتر کر اپنے منتظر بچوں سے ملنے کی بجائے سیدھا اپنے کمرے چلی جاتی ہے تو اس کے بچے بھی اپنے کمرے میں سونے چلے جاتے ہیں۔اگلے دن گیارہ بجے اوپریشن کے وقت رمیش سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے وہ ہسپتال سے ہو کر جاتی ہے تو عین اسی وقت اسٹریچر پر بے حس وحرکت کے سی کو نرسیں آپریشن تھیٹر لے کر جارہی ہوتی ہیں۔اتنے میں نرس کے باہر آنے پر آپریشن سے متعلق سوال پر نرس فوری انکار کر دیتی ہے لیکن نرس کی آنکھوں سے برسنے والا حیرانگی کااظہار تیرا میراکی آنکھوں کے رستے اس کے دل میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے۔افسانہ نگار نے افسانے کی مرکزی کردار کی خود غرضی اور بے مروتی پر مبنی رویے کے توسط سے معاشرے کی خودغرضی ، لالچ اور بے وفائی کے پس منظر میں پروان چڑھنے والے منفی معاشرتی پہلوؤں کی بخوبی عکاسی کی ہے۔

اسی طرح" ایک شام کی بات چیت" کے عنوان سے زیر نظر افسانہ متمول خواتین کی بےبنیاد اور لایعنی پریشانیوں کی زندگی بسر کرنے کے طور طریقوں اور بلا وجہ دوسروں پر رعب جمانے کی فطرت کا عکاس ہے۔افسانے کے آغاز میں مسز راضی، راوی کو اپنی مصروفیات اور قیمتی گھریلو استعمال کے سامان، میک اپ، مصنوعات اور قیمتی ملبوسات کے بارے میں آگاہی دلانے کے علاوہ کتب بینی سے اپنی شدید نفرت کی وجوہات بھی بیان کرتی ہے۔دوران گفتگو مسز راٹھی کے ڈاکٹر کو اپنے موٹاپے سے متعلق مشورے کے لیے وقت مقررہ پر نہ پہنچ پانے پر معذرت کا فون کرنے پر جب ڈاکٹر اسے گھریلو کاموں میں مصروفیت کا مشورہ دیتا ہے تو اسے جھاڑ بھی پلا دیتی ہے،کہ وہ کام والی ماسی ہر گز نہیں ہے۔موسم کے تذکرے کے بعد باتوں کی رسی مسز راٹھی دیسی اشیاء کی خرابیاں شمار کرتے ہوئے مسزراجیش کو فون پر ریستوران میں بیٹھ کر آپس کی باتوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتی ہے۔مز راجیش ریستوران میں موجود ایک نو جوان لڑکے کے ہی کے پڑھا لکھا ہونے پراس کی تعریف تو کرتی ہے مگر ساتھ ہی اسے تنقید کا نشانہ بھی بناتی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بہت جلد فری ہو جاتا ہے۔کسی کو نہایت اکھڑ مزاج اور نکما کہتے ہوئے اس کے دوست کی مثال پیش کرتی ہے کہ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی اس کے دوست نے کافی دولت کمالی ہے۔مسز راٹھی کے خیال میں پڑھائی کا اصل مقصد دولت کماناہی ہے۔مسز راٹھی شادی کے بعد اپنی سوشل کاموں کی مصروفیت کے بارے میں گفتگو کے بعد کے ہی' کی مصروفیت کے بارے میں انتفسار کرتی ہے تو ' کے سی' جواب دیتا ہے کہ سوشل کام کرتا ہوں۔ یعنی انسان کو اس کی اپنی ذات سے یعنی اپنے آپ سے ملواتا ہوں۔مسز راٹھی انگلی سے اس کے سکی ہونے کا اشارہ کرتی ہے۔اتنے میں' کے سی' اور مسز راجیش کے مابین پسندیدہ ناموں پر بحث میں مسزراجیش کے اپنا پسندیدہ نام روز نا بتانے پر کے ہی اسے آئندہ سے "روز نا" کے نام سے ہی مخاطب کرنے کی یقین دھانی کراتا ہے۔اسی طرح کی لغو و بے سر و پا گفتگو سے مسز راٹھی کا سر بھی بھاری ہونے لگتا ہے اور راوی بھی خود کوبوجھل سا محسوس کرنے لگتا ہے۔مسز راٹھی کے کسی سے اس کے اصل نام سے متعلق سوال پر وہ ہنس کر ٹال جاتا ہے کہ اس نے ابھی تک اپنا کوئی نام رکھا ہی نہیں ہے۔" کے سی" کے اٹھ کھڑے ہونے پر مسزراجیش بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑی ہوتی ہے تو مسز راٹھی دونوں کے اکٹھے کھڑا ہونے پر مسزراجیش کو بھی جلد بدل جانے کا طعنہ دیتی ہے لیکن راوی کا ذہن اب اس فضول بحث کے چکر سے باہر نکل آتا ہے۔دیویندراسر افسانے میں معاشرتی رویوں کے کھو کھلے پن پر شدید طنز واستہزا کرتے ہوئے امیر خواتین کی لایعنی مصروفیات اور کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

افسانہ"ایک شام اور وہ آدمی "کا راوی کسی تنہا مسافر کی طرح برآمدے میں اکیلے شام گزارنے پرپریشانی محسوس کرتاہے۔اس نے کہا کہ وہ دوستوں کی آبادی میں قیام پذیر ہوا تھا جہاں اس کی دوست "موہن تارا" نے بھی بذریعہ تارا اپنے نہ آنے کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے اسے مزید تنہائی کا شکار کر دیا تھا۔تیز بارش کے سبب اس کی تنہائی میں مزید شدت آگئی تھی کہ اتنے میں دروازے کی آہٹ پر باہر جھانکنے پر اسے جھریوں بھرے چہرے والا آدمی ستون کے سہارے سگریٹ سلگانے میں مصروف دکھائی دیا،جو بارش میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

مکمل طور پر بھیگ جانے پر ماچس سے سگریٹ تک نہیں سلگا پارہا تھا۔راوی کے کہنے پر وہ اندر چلا آیا تو راوی اسے خشک کپڑے اور تولیہ دے کرباتھ روم کے دروازے کی نشاندہی کرتے ہوئے فریش ہونے کا کہہ کر خود آگ کا الاؤ مزید روشن کرنے کے بعد باہر بارش کے مزید تیز ہونے پر یہ سوچنے لگا کہ اگر وہ اس اجنبی شخص کو اندرنہ آنےدیتا تویہ بوڑھا باہرسردی میں کہیں مر ہی نہ جاتا۔ اجنبی کے نہا کر باہر آنے پروہ راوی کے ساتھ رات قیام کی دعوت بھی قبول کر لیتا ہے۔دوران گفتگو وہ بوڑھا آدمی اپنے دلیش بدیش گھومنے کے شوق میں شادی نہ کر سکنے کے باوجود خوش رہنےاورتنہائی محسوس نہ کرنے کے بارے میں تاتاہے کہ گھومنے پھرنے کے شوق میں وہ بچپن میں ہی گھر سے بھاگ نکا تھا کیونکہ درختوں ،پہاڑوں اوربہتے پانی سے کسی انسانی لمس کے بغیر بھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔راوی کے اس جواب پر کہ اسے محض شاعری ہی کہا جاسکتا ہے تو اجنبی راوی سے مخاطب ہو کر سوال کرتا ہے کہ "نو جوان ! تم میرے لیے اور میں تمھارے لیے اجنبی ہی سہی لیکن ان چند لمحوں کی رفاقت سے عمراور بیگانگی کے تمام فاصلے مٹ نہیں گئے ؟" لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انسان جب حسن یا خوشی کے جذبات کا اظہار کرے تو شاعری ہے اوراگرزندگی کے اصل حقائق بیان کرے تو شور اٹھتا ہے کہ یہ تو محض ایک فلسفہ ہے۔بوڑھے کے ہاتھ کا پہنے سے چائے گرنے پر بوڑھا معافی مانگتے ہوئے مسکرا کر کہتا ہے کہ شاعری میں یہ سب ہو کر ہی رہتا ہے۔تنہائی کے دکھ، کرب اور آخری عمر میں شادی کی ضرورت کے سوال پر بوڑھا اجنبی پر مسرت لہجے میں جواب دیتا ہے:

> میں اکیلا کہاں ہوں؟ میں اکیلا نہیں مجھے تنہائی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔مجھے دیش بدیش گھومنے کا بڑا شوق ہے۔اسی شوق کے باعث میں بچپن ہی میں گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ جب میں رنگ برنگے پھولوں سے لدے کسی پودے کو لہلہاتے دیکھتا ہوں تو میرا جسم رنگ، خوشبو اور خوشی سے بھر جاتا ہے۔جیسے میرے جسم پر عمر کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ جیسے میں ایک خوبرونازک خوشنما پودا ہوں۔ جب بھی میں کہیں دور بانسری کی آواز سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سر کی لہریں میرے چہرے کی جھریوں میں داخل ہوگئی ہیں۔اور جھریاں بھر گئیں ہیں۔اور میرا جسم ستارسانچ اٹھتا ہے۔"(۹)

یوں بوڑھے اجنبی کی آنکھیں تھکن سے بند ہونے پرراوی اس کے چہرے کی کتاب پڑھتے ہوئے میں "اکیلا کہاں ہوں ؟ اور میں اکیلا نہیں ہوں"کے الفاظ ذہن میں دُہرا کر لطف اندوز ہوتے ہوئے خود بھی سو جاتا ہے۔صبح وہ بوڑھا اجنبی لباس تبدیل کر کے اپنا پائپ میز پر ہی چھوڑ کر نکل جاتا ہے،تو تنہائی کا احساس اسے پھر سے سانپ کی طرح ڈسنے لگتا ہے۔ایک عرصہ بیت جانے کے باوجود بھی راوی تنہائی میں اس اجنبی بوڑھے کے پائپ میں تمبا کو بھرنے کے بعد کش لگا کر خیالوں میں اس سے باتیں کرتے ہوئے مقام ، وقت اور جسم کے سارے فاصلے ملتے محسوس کرنے لگتا ہے۔

افسانہ" شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" اس عورت کی کہانی ہے جو محبت میں اپنا سب کچھ اپنے محبوب پرواردیتی ہے مگر اس کا محبوب بے وفائی کرتے ہوئے اس کے حاملہ ہونے پر نتائج بھگتنے کے لیے اسے تنہا چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے۔ماں باپ اور بھائی کی مخالفت اور طعنے برداشت کرنے کی بجائے وہ اپنے نوزائدہ بچے کا گلاخود ہی گھونٹ دیتی ہے مگر دوسری جانب بچوں سے شدید پیار کی وجہ سے وہ اسی ہسپتال سے کسی کا نوزائدہ بچہ اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار ہو کر جیل چلی جاتی ہے۔راوی کا دوست اسے بتاتا ہے کہ اک اجنبی عورت اس کے گھرزبردستی گھس کر اس کے ساتھ رات بسر کرنے پراصرار کرتی ہے مگر جب وہ اسے چھوتا تک نہیں تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے اور شدید غصے میں آکر چیختی ہے:

> " اگر میرے ہاتھ میں بندوق ہوتی تو میں تمھیں گولی مار دیتی۔یہ کہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔اس نے ایک لحظہ کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔میں نے اسے سہارادے کر آرام کرسی پر بنا دیا اور

> وہ گھٹنوں پر کہنیاں لگائے، منہ چھپائے دیر تک روتی رہی۔میں اس کے سامنے چار پائی پر بیٹھ گیا۔وہ عورت مجھ سے نفرت کرتی تھی یا اسے سب مردوں ہی سے نفرت تھی۔اس لیے اس نے اتنے درشت لہجے میں کہا کہ اگر میرے پاس بندوق ہوتی تو میں تمھیں گولی ماردیتی۔"(۱۰)

اس طرح راوی کے دوست کے دلا سے پر اجنبی عورت اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سناتی ہے کہ بیک وقت قتل، اغوا اور اقدام خودکشی جیسے تین مقدمات کا سامنا کرنے کے بعد اسے دنیا میں کسی پر بھی بھروسہ نہیں رہا،اسی لیے اپنا ہی بچہ دوبارا پیدا کرنے کی خواہش میں وہ راوی کے دوست سے اجنبیت کے باوجود ہم بستری کے لیےاس کے گھر زبردستی گھس آئی ہے۔راوی کا دوست بچوں سے گہرے پیارکی وجہ سے اسے مستقبل کی بہترین ماں سمجھتے ہوئے اس سے شادی کر لیتا ہے۔

افسانہ"درد کا درخت "کی کہانی میں بھی، میں اور وہ کا طرز تکلم اپنایا گیا ہے جس میں دو دوستوں کی بیروزگاری کے پس منظر میں کہانی کا آغاز راوی کی اپنے لڑکپن کے دور میں پروان چڑھنے والی دوستی کی یاد سے ہوتاہے۔ جب وہ اپنے دوست کے ساتھ درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ایک بزرگ کے سوال پر کہ "ینگ مین کیا حال ہے؟" کے جواب میں راوی ہونے نے اس بزرگ کو بتایا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ ہے اور بے روزگاری کے ہاتھوں فکر مند ہے، کہ کہیں اس کی زندگی کے رنگ ہی پھیکے نہ پڑ جائیں۔بزرگ کے چلے جانے کے بعد قسمت آزمائی کے لیے پونا چلا آیا اور کچھ عرصہ ٹھیکیدار کے ہاں ملازمت کے بعد اس نے راوی کو اپنی بے روزگاری کے بابت خط بھی لکھ بھیجا تھا،مگر مصروفیت کے باعث راوی بھی جواب نہیں دے پایا تھا۔محبوبہ اورجیب خرچ کی پریشانی سے متعلق مختصر سے خط میں اس نے اپنی عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی جیولیٹ کے گھردیرسےآنے کی شکایت بھی لکھ بھیجی تھی۔ حالانکہ اسی جیولیٹ نے اس کی سابقہ محبوبہ کی کہیں اورشادی اور پھراس محبوبہ کی بیمار بچی کی تصویر دیکھنے کے بعداس کا ساتھ دیتےہوئےراوی کےدوست کے دل کو لگے گہرے گھاؤپرمرہم بھی رکھا تھا۔دوست کی بے روزگاری اور پریشانی کے خیالوں میں کھویاراوی خط کے جواب کی بجائے بذات خود اس کے پاس پوناجاتا ہے۔ملاقات پر راوی کا دوست کوروتے ہوئے اپنے دکھڑے سناتا ہے کہ رمتا' نے اسے اپنے پاس رکھتے ہوئے کھانے پینے اور پیروں کے علاوہ جیب خرچ کی ذمہ داری بھی اٹھائی ہوئی ہے۔ مگر اب اس سے مزید بیروزگاری برداشت نہیں ہورہی۔پڑو نے راوی سے اس کی داستان محبت سننے کے اشتیاق میں اپنے ساتھ باہر جانے پر اصرار کرتا ہے۔راوی تخیل اور حقیقت پر مبنی جذبات سے دل میں نہاں رمنی' کی محبت اوراس کے انجام کی کہانی سناتا ہے کہ امتی کووہ بھوک،افلاس اوربے روزگاری کے باعث حاصل نہ کر پایا جس کے بعد راوی ، ڈی ایچ لارنس کی نظم گنگنانے لگتا ہے:

> " چیز کا درخت سخت یا چٹانوں کا سینہ چیر کر اوپری او پر بڑھتا چلا جارہاتھا۔اوور بھری پھیلی ہوئی اس کی شاخیں نیچے ہی نیچے جھک رہی ہیں۔زمین کے نیچے چیز کی جڑیں بہت گہری ہیں۔اوراس کے پیلے پیالوں کی مانند بلندی پر چاندنی کی شراب پی رہے ہیں۔"(۱۱)

دور کہیں بانسری بجنے کی آوازسننے پڑو نے پکارتا ہے کہ وہ چیز کا درخت بنا چاہتا ہے۔اور جب و نے اپنی دونوں بھنیاں اور اٹھ کر ہو میں ہر کر نھیں کھول دیتا ہے تواس بہتے پانی کا دردبھرا گیت رگوں میں دوڑ تامحسوس ہوتا ہے۔

افسانہ"کوئی بھی ایک آدمی"کا آغازراوی ۱۹۲۲ء کے کسی خوش قسمت اوربڑے آدمی پر کہانی لکھنے کے ارادے سے ہوتا ہے کہ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہونے پراستفسار کرتا ہے کہ کون ہے؟ توکوئی بھی ایک آدمی کی آوازپراسے باہر دبلا پتلا سادہ آدمی دکھائی دیتا ہے،جوراوی کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر سیدھا اندر داخل ہوتے ہی کنڈی لگانے کے بعد چھپیس پچاس روپوں کا تقاضا کرتا ہے۔ راوی کے انکارپروہ گتھم گھتا ہوکراس کا گلا دباتے ہوئےاس کےبٹوےمیں موجودہ پچیس روپےنکال کرلے جاتا ہے۔راوی دوبارہ لکھنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا ہے لیکن کچھ ہی دیربعد دروازے پراسی شخص کے دوبارہ دستک دینےپرراوی شورمچا کرلوگ اکٹھے کر لیتا ہے جو اسے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔اسی دوران وہ خاموشی سے اپنی مٹی کھول کرراوی سے چھینی گئی رقم زمین پر بکھیر دیتا ہے۔

لوگوں کی مارپیٹ سے اس کے سینے سے چھٹی گھڑی کا کپڑا اسرک جانے پر بھی بچی کی مردہ لاش دیکھتے ہی راوی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ہوش وحواس بحال ہونے پرراوی کاغذ نکال کر ۱۹۲۲ء سال کے سب سے بڑے آدمی پر لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔اس کے خیال میں سال کا سب سے بڑا آدمی اب کوئی اور نہیں بلکہ وہی کوئی بھی ایک آدمی ہے۔

افسانہ"خون جگرہونے" تک ایک ایسے مصورکی ناقدری کی داستان ہے جسے معاشرہ تواہمیت نہیں دیتا مگراس کی بیوی اس کےفن کی بچی قدردان ہےجواس کےفن پاروں پر بھاری رقم کے بدلے بھی کسی اورکاکندہ نام برداشت ہی نہیں کرتی۔فن مصورکی میں ڈوبے باشندے اپنے فنی معیارپرمکمل پراعتماداورپریقین ہوتا ہےکہ ایک نہ ایک دن دنیا اس کے فن کی قدردان ہوکررہے گی جس سے اس کے تمام دکھ تکالیف اورمعاشی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ایک روزوہ بیوی کواپنے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے والے عظیم فن پارے کی تخلیق کی خوشخبری دیتا ہےمگراس کی بیوی اسے محض اپنے خاوند کی خام خیالی ہی سمجھتی ہے۔دوسرےدن شہدنےکےفن پارےپرآرٹ ڈیلر کے تبصرے : "ان چیزوں کو آج کل کون پوچھتا ہے؟"" کے بعد اس کی بیوی کے خیالات کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔وہ ناکام و نامراد گھر واپس لوٹتا ہے، مگر آرٹ ڈیلر کے باربار دہرائے ہوئے بڑے فنکاروں کےنام اس کےذہن میں نقش ہو کررہ جاتے ہیں۔واپسی پر مایوسی اورگہری سوچ میں غلطاں شندے کے ذہن میں اٹھنے والے خیالات اس کے دل میں امید کی اک نئی کرن بیدار کر دیتے ہیں، جسے عملی جامعہ پہناتے ہوئے وہ ایک تصویرسےاپنا نام کھرچ کراورمالکھنے کے بعداسی ڈیلرکوفن پارہ دکھاتے ہوئے اس طرح کے مشہورمصوروں کی ڈھیروں تصاویراورمجسموں کےذخیرے کی موجودگی کی اطلاع دیتا ہے۔آرٹ ڈیلر جانچ پرکھ کے بعد اسے غیرمعمولی رقم کی فوری اورادائیگی بھی کر دیتا ہے۔شندے اپنی بیوی کے لیے ساڑھی اور پر فیوم وغیرہ خرید کر ہنسی خوشی ساراماجرابیوی کے گوش گزار کرتے ہوئےدوسری تصویرکے فریم سے بھی اپنا نام کھرچ کرمشہورمصورکانام لکھ کرایک بارپھرآرٹ ڈیلر کے پاس جانے کی تیاری کررہاہوتا ہے ،کہ اس کی بیوی وہ تصویرچھین کرنیا لکھا ہوا نام کھرچ کردوبارہ شندے کا ہی نام لکھ دیتی ہے۔ جس سے شندے کی آنکھوں میں آنسو بھرآتے ہیں۔اسے دنیا والوں کی جانب سے اپنی ناقدری پر دکھ اورافسوس ہونے کے ساتھ ساتھ بیوی کی اپنے فن کی قدردانی پر دلی مسرت بھی ہوتی ہے۔

افسانہ"وہ ایک لمحہ" مالی مجبوریوں میں گرفتارانسانوں کی کربناک زندگی کی داستان ہے جس کا آغاز بھی دیویندراسرکے اکثرافسانوں کی طرح بس سٹاپ سے ہوتا ہے جہاں ایک لڑکی مقررہ وقت پر بس کےانتظارمیں سیٹ کے حصول تک مسافروں کا رش ختم ہونے کے انتظار میں کھڑی رہتی ہے۔راوی کالڑکی کو گھنٹوں قطارمیں کھڑے دیکھنے کاسلسلہ اس کے بس شاپ پرآنا بند ہونے تک جاری رہتا ہے۔راوی اس لڑکی کی تلاش میں دیگرشاپوں پربھی جاتا رہااورایک دن اسی کی مشابہ لڑکی کسی اورشاپ پربس کے آتے ہی دھکم پیل اوررش میں سےاپناراستہ بنا کرآگے بڑھتی ہوئی کنڈیکٹرکے بازو پکڑ کراوپرکھینچنےپربس میں سوارہونےمیں کامیاب ہوجاتی ہے۔اس کے بعداس لڑکی کے ہرجگہ دکھائی دینے پرراوی اس کے کردارپر شک کرنے لگتا ہے۔اک روزاسی لڑکی کی جھلک آوارہ اوربدنام لڑکیوں کےجھرمٹ میں نظرآنےپرجب راوی اس کا پیچھا کرنےلگتا ہےتووہ بھی رفتارمدہم کرتے ہوئے رک جاتی ہےاورراوی کی جانب سےاس کےساتھ چلنےکی دعوت پروہ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس کے ساتھ چل پڑتی ہے۔گھر پہنچنے پرلڑکی کے چہرے سے پردہ ہٹانے پرراوی کویقین ہوجاتا ہے کہ یہ تووہی پہلےوالی لڑکی ہی ہے۔لڑکی بھی مسکراکرجواب دیتی ہے کہ زندگی کے حادثات میں جو دکھائی دیتا ہے۔حقیقت وواقعات اس کے برعکس ہوا کرتے ہیں۔

اس طرح آرام کرسی پرنیم درازہونے پرراوی کی سگریٹ کی پیشکش وہ لڑکی سگریٹ نوشی کی عادی نہ ہونے کا کہتے ہوئے گاہک کی مرضی کے خلاف اپنی حرکت پر شرمندگی کا اظہار بھی کرتی ہے۔راوی کے جواب پرکہ وہ اس کا گاہک نہیں بلکہ پرستار ہےتولڑکی جلد فارغ کرنے کی استدعا کرنے لگتی ہے۔راوی کے وہسکی پیش کرنے پراسے بلاضرورت کہتے ہوئے پینےسےانکارکردیتی ہے۔

راوی کے ناچنے کے بارے میں سوال پر جواب دیتی ہے کہ ناچنے کا فن سیکھنے کے ارادے کےکراتےہوئے جواب دیتی ہےکہ کوئی ذہنی فرحت کرتا ہےاورکوئی جسم بہرحال بزنس توبزنس ہی ہے۔اپنا نام ایسا نہ تواس کا بدن دیکھنےاورنہ ہی کسی کے چھونے کا انکشاف کرتی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

ہے۔راوی کے طنزیہ استفسارپرکہ دیوی جی پھرمیرےپہلی تاتے ہوئے اپنے دھندے کے پہلے دن اورپہلی بارسگریٹ پینےاوروہسکی کو پہلے بھی نہ چھونے اوراب تک کسی غیرمرد کے مرجہ کہنے پرہی کیوں چلی آئی؟ توجواب میں وہ کہتی ہے کہ دفترسےواپسی پرباقی مردوں کی طرح تمھاری آنکھوں میں بھی بھوک دیکھی جس سے اپنا آپ ہمیشہ بچاتی آئی ہوں، مگر پھریہی بھوک ٹریجڈی بن جانے پر اب سوچ رہی ہوں کہ ان نگاہوں کا پہلے سے شکار کیوں نہ ہوئی؟

اس طرح راوی کے حوصلہ دلانےپروہ اپنی داستان سناتیہے کہ جب وہ (ایبا) ریسپشنسٹ تھی۔ جب بھی لوگ کسی نہ کسی سےاس کا تعلق جوڑے رکھتے۔ایک دن فرم کے مالک کے گھرلےجا کرزبردستی وہسکی پینے سےانکارپرجب وہ اس کےمنہ پرتھوک کرچلی آئی تونوکری سے فارغ کیے جانے پربھی اسے کسی آشنا سےجنسی تعلق کے باعث ملازمت کی برطرفی کے طعنے منے پڑے تھے۔راوی بھی اس کی باتیں محض رٹی رٹائی داستان کے طور پر سنتا رہا۔وہ مزید تفصیل بیان کرتی ہے کہ اسے کبھی کامران نہ آیا تھا۔کبھی وہ کام کو نہ آ سکی مگروہ بیماراں کےعلاج اوردوچھوٹے بھائیوں کی پرورش کی خاطرحالات کا پھر بھی مقابلہ کرتی رہی ہے۔ایک خدا ترس انسان نے روزانہ اجرت کی ادائیگی کی بنیاد پراسےاپنے ہاں ملازم رکھ لیا، مگراس کی دیوی نےدفترآکراسےملازمت سے فارغ کروادیا۔راوی سےملاقات پربقول ایبا پہلےتودل چاہا کہ تمھارے منہ پرتھوکوں مگرپھربیماراں کا چہرہ آنکھوں میں گھوم جانے پر نجانے وہ کون سا کمزورلمحہ تھا کہ انکار کی بجائے تمھارے ساتھ چل پڑی۔البتہ یہ طے ہے کہ اب جسم کے ساتھ میری روح بھی بھسم ہوکررہ گئی ہے۔ایبا بولتے ہوئےوہ راوی کے چھیننے کی کوشش کے باوجودپورے کا پوراوہسکی کا گلاس غٹاغٹ پی کر چیخنے چلانے لگتی ہے، کہ اب شراب کیا اور آبرو کیا؟ لیکن وہ ایک لمحہ کبھی نہیں بھول پائے گی ،جب یہ فیصلہ کیا تھا کہ زندگی کی سیاہی سے نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے ، وہی ایک لمحہ۔

اس طرح"چاندنی اور جالے"اس مجموعےکاآخری افسانہ ہے جس میں رمزیت اور مبہم استعارات کے اسلوب میں واحد غائب انداز تکلم میں مرکزی کردار مونا اپنی زندگی کے بارے میں بیان کرتی ہے۔کہ شادی سے پہلے اس کی اکثرشامیں محبوب جیت کے ہمراہ گزرتی تھیں مگر شادی کے بعد پیدا ہونے والے بچے کی وجہ سے اب وہ گھر سے باہر نکل ہی نہیں پاتی۔یہی وجہ ہے کہ دونوں کا اکٹھے کوئی فلم دیکھے ایک عرصہ ہو گزرا ہے۔مونا یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ اب جیت کی اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی کیونکہ جیت اب ہر وقت سو جاتا ہے اور صبح سویرے کام پر چلا جاتا ہے اس لیے مونا اب اپنے دن رات ماضی کی یاد کے سہارے ہی بسر کرنے پر مجبور ہے۔مونا کو اپنے ماضی کے دوست ششی کی باتیں آج بھی یاد ہیں جب ششی اکثر کہا کرتا تھا کہ مونا اب تمھارا بچہ بھی ہے اور دونوں کے اک دوسرے کو سمجھ کر شادی کرنے سے اب جیت کو تمھارے بارے میں اور تمھیں اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوئی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ تمھیں جیت سے پیار ہے۔ ششی کے خیال میں وہ دونوں اک دوسرے کو پاسکتے تھے مگر مونا نے جیت سے شادی کے بعد پانے اور سمجھنے کے لیے کچھ پیچھے چھوڑ ہی نہیں تھا۔اس گفتگو کے بعد مونا کے ششی کی جانب ہاتھ آگے بڑھانے پر وہاں کوئی موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ سب ان کا وہم تھا۔ایک بارجیت کو کمرے میں بےہوش پا کرآئینے میں اپنا جوان شعلے اگلتا توانا جسم دیکھ کر وہ اپنے بال جھٹک کر باہر نکل آئی مگر باہر بھی اسے ہرسوپرچھائیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔"چاندنی اورجالے"افسانہ محبت پروان چڑھنے کے بعد محبوب کی جانب سے برتی جانے والی بے اعتنائی اورعورت کی محبت کے لیے مسلسل تڑپ کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔سریش سیٹھ "پرندے اب کیوں نہیں اڑتے" مجموعے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”پرندے خوابوں کی اس بارات کی مانند ہوتے ہیں جسے انسان جوانی کی جانب سفر کرتے ہوئے سجانا شروع کرتا ہے پھر بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی خوابوں کی مانند یہ پرندے ایک ایک کر کے دم توڑ نا شروع کر دیتے ہیں۔جب خوابوں کا آسمان پرندوں سے خالی ہو جاتا ہےاورزندگی کاسفراپنے اختتام کی منڈھیرپردم لینے لگے تو پھروہ اپنےسفر کی داستان مرتب کرنے لگتا ہے۔اگر داستان سفر کا راوی دیویندراسرجیسا با شعوراورحساس

طبیعت کا مالک اہل قلم ہو تو پھر اس کا معاشرے سے یہ سوال کرنا حق بنتا ہے کہ پرندے
اب کیوں نہیں اڑتے؟"(۱۲)

دیوندراسر زندگی بھر تلخ ایام کا زہر پینے پر مجبور رہے ہیں،لیکن زندگی کے دکھوں کی تلخیاں اور اپنوں کی بیوفائیاں باہم مل کر بھی ان کا کچھ بگاڑ نہ پائیں۔دیوندراسر کا شماراُن گنے چنے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو بطور تخلیق کار تیزی سے بدلتے حالات اور حقائق کا از خود سامنا ہی نہیں کیا بلکہ بدلے حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کی معرفت عرفان ذات تک کامل رسائی پانے میں بھی کامیاب رہے۔دیوندراسر کے افسانوی کردار حالات کے ستائے ہوئے اندر سے دکھی تو دکھائی دیتے ہیں مگر پھر بھی ان میں انسانی ہمدردی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دیوندراسراسا"وے سائڈ ریلوے سٹیشن "،"پرندے اب کیوں نہیں اڑتے"،ایجوکیشنل پبلشرز،دلی ،ص ۱۳
۲۔ایضاً،ص۱۳
۳۔ایضاً،
۴۔ جنگل:ایضاً،ص۳۴
۵۔ایضاً: جیسلمیر : ص۵۹
۶۔ دیوندراسر،"پرندے اب کیوں نہیں اڑتے:ایضاًص۷۰
۷۔ایضاً
۸۔ روشنی کا سفر:ایضاً،ص۸۹
۹۔ایضاً:ایک شام اور وہ آدمی:ایضاً،ص۱۱۱
۱۰۔ایضاً: شمع ہر رنگ میں جلتی ہے:ایضاً،ص۱۱۵
۱۱۔ایضاً:درد کا درخت:ص۱۲۸
۱۲۔ سریش سیٹھ درد اپنا ہے، مشمولہ "ایک دانشور ایک مفکر" ، ۲۰۱۳،ص۳۹